Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:11 (1967)

افکار و آراء

محترم مدیر مجلّہ "فکر و نظر"

مارچ کے شمارے میں جناب اسلم صدیقی صاحب کی مشہور کتاب A PATH WAY TO PAKISTAN کے ایک باب کا ترجمہ بعنوان "نظریۂ پاکستان کی تشکیل نو" نظر سے گزرا۔ اس کا مطالعہ نہایت ہی مفید اور خیال انگیز رہا۔ صدیقی صاحب نے اس اقتباس میں جس جرأت اظہار، دیانتِ فکر اور ذہنی پختگی کا ثبوت دیا ہے، وہ ہمارے ملک کے پڑھے لکھے طبقے میں جو اسلامی نظریات اور تاریخ سے دل چسپی رکھتا ہے عموماً مفقود ہے

پاکستان اسی صورت میں ایک خوش آئند مذہبی اور نظریاتی نشاۃ ثانیہ کی توقع کر سکتا ہے جب ہم سب مجموعی اور انفرادی طور پر اسلام کے عروج و زوال، مذہبی عقائد، رسومات، فرقوں اور مذہبی تعلیم و تدریس کے طریقوں کے متعلق حتی الامکان ہر قسم کے تعصبات سے بلند ہو کر اور ایک حد تک روشن خیالی سے کام لیتے ہوئے سوچ کی نئی راہیں متعین کریں۔ اور ہر وقت پیچھے کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے گرد و پیش اور آگے کی طرف دیکھنے کی بھی عادت ڈالے۔ ہر چند کہ ہدایت اور راہنمائی کا منبع ماضی میں ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ قرآن و حدیث حال و مستقبل کی بھی رہنمائی کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور حدیث نبوی یقیناً ہماری دینی اور دنیاوی رہبری کا لافانی ذریعہ ہیں۔ لیکن گزشتہ تیرہ سو سال کے تاریخی عمل سے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں ان سے رہنمائی حاصل کرنا اور ایک خوشگوار، صحت مند اور عظیم مستقبل تعمیر کرنا ہی اصل کام ہے۔

اسلم صدیقی صاحب کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ بعض احادیث کی حیثیت وقتی اور مثالی تھی اور یہ کہ ہمیں یہ امر ہمیشہ مدّ نظر رکھنا چاہیئے کہ مذہبی تحریکوں اور مذہبی فرقوں کو ان کے سیاق و سباق میں سمجھیں اور ان کے سماجی، معاشی اور سیاسی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے روشن ضمیری کے ساتھ ان پر عمل کریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہماری سوچ بے جان ہو کر رہ جائے گی۔ اور جدید علوم اور سائنسی نظریات سے مستفید ہونے

والی نئی نسلوں کو متاثر نہ کر سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اسلام اور علماء دین اپنا احترام کھو بیٹھیں گے۔ کم و بیش ایسی ہی صورت حال سے آج کا معاشرہ دوچار ہے۔ محض روایتی نقطۂ نظر کی تبلیغ و تشہیر سے ایک نئے اور صحت مند معاشرے کی تحقیق و تعمیر میں مدد ملنے کی بجائے مزید رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

ہمیں اپنی تاریخ اور جملہ مذہبی فرقوں کے لٹریچر کا سائنٹیفک نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کی تہہ میں کون کون سے سماجی، سیاسی اور معاشی عوامل کارفرما تھے۔ ایک خالصتاً غیر جانبدارانہ، حقیقت پسندانہ اور سائنٹیفک انداز نظر کی تخلیق قرآن و سنت کے عین مطابق ہوگی کیونکہ قرآن کریم اور حدیث نبوی میں اس امر پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ انسان "فکر" کرے اور اپنے اندر گرد و پیش کے حالات کو صحیح طور پر سمجھنے کا شعور پیدا کرے حتیٰ کہ حصول علم اور تلاش حقیقت کے لئے دور دراز کے ممالک کے سفر کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآنی تعلیمات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم جو کچھ دیکھتے، سنتے اور پڑھتے ہیں اسے بلا تحقیق و جستجو کے قبول نہ کریں۔ مذہبی معاملات و نظریات میں مخلصانہ اختلاف رائے کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ مذہبی خیالات میں تنگ نظری، تعصب اور تکبر کا فقیر ہونے کی عادت ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی معاملات میں کسی قسم کی اصطلاح اور روشن خیالی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ۹۹ فیصد مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ مذہبی معاملات و نظریات پر "غور" کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور جو نوجوان ایسا کرتے ہیں، انہیں کافر، مرتد، ملحد اور بدعتی کے القاب سے نوازا جاتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی جاتی کہ ان نوجوانوں کی سوچ میں کس حد تک خلوص اور دیانتداری پائی جاتی ہے کسی مذہبی عالم سے مذہبی بحث کرنا اور اس کی رائے سے اختلاف کرنے کا نتیجہ عموماً ناخوشگوار ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے آج پڑھے لکھے لوگ آپس میں تو مذہبی بحثیں کرتے ہیں لیکن علماء سے رجوع کرنا پسند نہیں کرتے۔

اسلم صدیقی صاحب کی یہ رائے کہ "ہمیں دینیات کی تعلیم کے موجودہ طریقوں کو بدل دینا چاہیئے" خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہند و پاک کے دینی مدرسوں نے گزشتہ سالوں میں عظیم خدمات انجام دی ہیں لیکن اب ان کی افادیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ دینی مدرسوں کا ماحول عموماً ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی دیوتا بیٹھا دیوتاؤں کی متبرک کہانیاں سنا رہا ہے۔ اور فانی انسان دوزانو بیٹھے اس الہام کو اس طرح سن رہے ہیں جیسے کہ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ بڑے بڑے مرتبان ہیں جن میں کوئی چیز اس لئے ڈالی جا رہی ہے تاکہ وہ لبالب بھر جائے۔ آپ کو شائد یہ انداز مضحکہ خیز معلوم ہو، لیکن میرے مشاہدے اور تجربے کے مطابق حقیقت کچھ ایسی

ہی ہے۔ طلبہ پر استاد اور سبق کا اس قدر رعب طاری رہتا ہے کہ اختلاف یا سوال کی جراءت ہی نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی طالب علم کبھی کبھار ایسا کرتا بھی ہے تو یا تو اس کی بات کا تسلّی بخش جواب نہیں دیا جاتا یا پھر اس کی گزارشات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ دراصل مفروضہ ہی یہ ہوتا ہے کہ پڑھائی جانے والی کتابوں اور ان کے مصنفین کو حرفِ آخر کا درجہ دینا چاہیئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہمارے ملک میں مستند اور غیر مستند علماء کی تو کمی نہیں لیکن ایسے علماء خال خال ہی ملیں گے جو روشن خیال ہوں، تعلیم و تدریس کے جدید طریقوں سے واقف ہوں اور اپنی بات سوال کرنے والے سے نفرت اور غصے کا اظہار کیئے بغیر عام فہم الفاظ میں سمجھا سکیں۔

اس اقتباس میں مذہبی فرقوں کے معاشرتی، سیاسی اور سماجی پس منظر، احادیث کے غلط اور خود غرضانہ استعمال، دینی تعلیم و تدریس کے جدید طریقوں کی اہمیت اور اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل نو پر نہایت ہی دلنشین، غیر جانبدارانہ اور خیال افروز طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس انداز نظر کو زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ اپنائیں تاکہ ہم اس مذہبی اور نظریاتی جمود سے نکلیں جو ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستانی بلکہ ساری دنیا کے مسلمان ٹھنڈے دل سے غور کرنا شروع کر دیں کہ آج ملت اسلامیہ ذہنی، اخلاقی، روحانی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے اس قدر پیچھے کیوں ہے اور یہ کہ ہم کیوں اسلام ایسے زندگی بخش دین سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس کا جواب وہی لوگ دے سکتے ہیں جو دین کے معاملات میں غور و فکر کے عادی ہیں۔ ایک عام مسلمان اس کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ اسے اپنے نظریات و عقائد ورثہ میں ملے ہیں اور اس کے پاس اتنا علم نہیں کہ وہ اپنے طور پر ان کی صحت و عدم صحت کا اندازہ کر سکے۔

بیسویں صدی کے مسلمان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریہ حیات کی از سرِ نو تشکیل کرے اور فرق اسلامی اختلافات کو مٹا کر اسلام کے بنیادی عقائد کو اپنائے تاکہ نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں میں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں ایک نظریاتی وحدت اور یگانگت پیدا ہو۔ آج کی دنیا نظریاتی وحدتوں میں بٹی ہوئی ہے اور یہی موجودہ نظریاتی اور سیاسی بلاکوں (B LOCKS) کی قوّت کا راز ہے۔ مسلمانوں کا مستقبل بھی نظریاتی وحدت کے وجود یا عدم وجود سے وابستہ ہے۔ اندریں حالات اجتہاد اور تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔

(سیّد شمیم احمد پیرزادہ۔ راولپنڈی)

طابع : ظہیر الدین ✳ مطبع : استقلال پریس لاہور